بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قرآن مجید نے کسی فرد یا قوم کی حرماں نصیبی کے جو مختلف مناظر کھینچے ہیں ان میں ایک دردانگیز منظر اُس بدنصیب بُڑھیا کا ہے جو مشقّت اُٹھا کر سوت کاتتی ہے اور پھر خود ہی اُسے تار تار کر دیتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی شخص جس کے ہوش و حواس قائم ہوں اور جسے اپنے مفادات بھی عزیز ہوں ایسی تخریب پسندانہ حرکت کا ارتکاب نہیں کر سکتا اور جو فرد اپنی محنت کو دیدہ و دانستہ اس طرح اکارت کرتا ہے وہ یا تو دیوانہ ہے یا اپنے مفادات کا دشمن۔ بظاہر کوئی شخص بھی جسے اپنی عزت کا پاس ہو ان الزامات میں سے کوئی الزام بھی اپنے سر لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ آخر کون یہ تہمت گوارا کر سکتا ہے کہ اُسے دیوانہ کہا جائے یا اُسے خود اپنا دشمن خیال کیا جائے؟ لیکن تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ ہم سب انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اس الزام سے برأت کا ہر لمحہ اعلان کرنے کے باوجود اپنی محنت کے ثمرات کو پیہم برباد کرتے رہتے ہیں۔ ہماری اس عاقبت نااندیشانہ روش کا زندگی کے ہر دائرے میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ انسان اِس بات کا کس قدر شدت کے ساتھ آرزومند ہوتا ہے کہ اُس کی جسمانی صحت اچھی ہو۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے وسائل کی حد تک بہتر خوراک اور آرام کی دیگر سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی اپنے جسم سے غیر معمولی دلچسپی کا تقاضا ہے کہ وہ ہر اُس چیز یا فعل سے دامن کش رہے جس سے اُس کی تندرستی بگڑنے کا خطرہ ہو کیونکہ یہ اُس کی محنت کا زیاں ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ بلا تأمل مضرِ صحت اشیاء کا استعمال کرتے ہیں اور تندرستی کو برباد کرنے والے قبیح افعال کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور اِس طرح خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہی معاندانہ طرزِ عمل

انسان اپنی اخلاقی صحت کے بارے میں بھی اختیار کرتا ہے بلکہ اس معاملہ میں وہ اپنا شدید دشمن اور بدخواہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ اندوہناک حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان کو خواہ اس تلخ حقیقت کا واضح شعور نہ ہو مگر اُس کا سب سے بڑا دشمن خود اُس کی اپنی ذات ہے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ بھرتا ہے اور اُسے آبِ حیات سمجھ کر غٹا غٹ پی جاتا ہے۔ وہ خود اپنے بازوؤں کی پوری قوت سے اپنے سینے کو چھلنی کرتا ہے مگر اس غلط فہمی میں مسلسل مبتلا رہتا ہے کہ وہ دشمنوں کے سینے چاک کر رہا ہے اور یہی غلط فہمی اُسے جلد ہی تباہی کے مہیب غاروں میں لے جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دُکھی شخص مصائب اور تکالیف سے گھبرا کر ایک مردِ درویش کے پاس گیا اور اسے اپنی بپتا سنانے لگا۔ وہ صاحب کچھ دیر تک اُس کی داستانِ غم جس میں اُس کے متعلّقین کے گِلے شکوے تھے سُنتے رہے اور پھر معنی خیز نظروں سے اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگے " تمہارا موقف بڑا کمزور ہے کیونکہ تم اپنے سب سے بڑے دشمن کو بعض مصالح کے تحت چھپانے کی کوشش کر رہے ہو" دل شکستہ انسان نے حیران ہو کر پوچھا " کونسا دشمن ؟" تو اُس بزرگ نے برجستہ کہا " تمہارا اپنا نفس " انہوں نے اپنے اِس فیصلہ کی صحت کا یقین دلانے کے لیے اُس سے کہا " تم صرف ایک دن کے اعمال کو کسی کاغذ پر درج کر کے سونے سے بیشتر اُن کا جائزہ لو اور دیکھو کہ دوسرے افراد نے تمہارا کس قدر نقصان کیا ہے اور ان چند گھنٹوں میں تمہارا خود اپنے ہاتھوں سے کس حد تک زیاں ہوا ہے۔ تم اس میزان پر جتنا غور کرو گے اتنا ہی تمہیں میرے دعوے کے صحیح ہونے کا یقین ہو جائے گا کہ ہمارے متعلقین سب مل کر بھی جس قدر ہمارا نقصان کرتے ہیں وہ اُس بربادی کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا جو ہم خود اپنے ہاتھوں سے لاتے ہیں۔

یہ اُصول اگرچہ انفرادی زندگی میں بھی بالکل صحیح ہے اور ہر قدم پر اس کی صحت کی شہادت ملتی ہے لیکن اجتماعی زندگی میں تو یہ ایک ایسی واضح حقیقت بن کر سامنے آتا ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے۔ آپ اگر تاریخِ انسانی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی قوم کو باہر کے دشمنوں نے اس قدر تباہ نہیں کیا جتنا کہ خود اپنوں نے، خصوصاً اُس قوم کے برسرِ اقتدار طبقوں نے اُسے نقصان پہنچایا ہے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کے حملوں اور اُن کے مظالم کی داستانیں بلاشبہ دل ہلا دینے والی داستانیں ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ دردناک وہ داستانیں ہیں جن میں ستم زدہ اقوام کا اپنے سربراہوں کے ذریعے لائی ہوئی ہولناک بربادیوں کا تذکرہ ملتا

ہے۔ تاریخ اور فلسفہ کے ماہرین کا فیصلہ ہے کہ قومیں کبھی کبھی آفاتِ سماوی کی وجہ سے بھی تباہ ہوتی ہیں مگر جو تباہی کسی قوم کے افراد خود یا اس کے برسرِ اقتدار طبقے لاتے ہیں وہ بڑی المناک ہوتی ہے۔

پھر قوم کے ان "خیر خواہوں" کے ہاتھوں لائی ہوئی بربادی کا سب سے زیادہ دلفگار پہلو یہ ہے کہ تعمیر کے پردے میں اس مظلوم قوم کی تخریب کا سامان کیا جاتا ہے اور اسے ہر لمحہ یہی تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہی ہے درآنحالیکہ وہ بربادی کے راستے پر گامزن ہوتی ہے۔ دُور نہ جائیے صرف اپنے ملک کے حالات پر غور کیجیے تو آپ کے سامنے اپنی ہی قوم کے اربابِ بست و کشاد کے ہاتھوں لائی ہوئی بربادی کا رُوح فرسا نقشہ سامنے آجائے گا۔

کسی قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ جس نصب العین کے حصول کی آرزو میں زندہ رہتی اور سرگرمِ عمل ہوتی ہے، اس نصب العین کے بارے میں اس کے اندر ذہنی انتشار پیدا کیا جائے اور اس کی یکسوئی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہماری قوم کی زمامِ کار رہی ہے وہ بیانات کی حد تک تو اسلام سے اپنی گہری وابستگی کا برابر اظہار کرتے رہے ہیں لیکن اللہ کے دین کو اس ملک اور قوم کا صحیح معنوں میں دستورالعمل بنانے کے سلسلہ میں کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا گیا بلکہ جب کبھی اس ضمن میں عوام کا دباؤ بڑھا تو اس سے گریز کی راہیں ہی نکالنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ غالباً سابق فرمانرواؤں کے اسلام گریز طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ اس ملک کے اندر جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور جس کے بارے میں اوّل دن ہی سے یہ امر طے شدہ تھا کہ اس خطۂ پاک کو اسلام اور صرف اسلام کی تجربہ گاہ بننا ہے وہاں موجودہ اربابِ اختیار کو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند لگانے کی جرأت ہوئی اور ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کے نعرے کے ساتھ انتخاب لڑیں۔ یہ کوئی جذباتی نعرہ نہ تھا بلکہ اس بات کا واضح اعلان تھا کہ ان حضرات کو اب اس قوم پر اسلام کے نام پر اشتراکی نظام مسلط کرنا ہے۔ اسلام کا ذکر تو برائے بیت تھا ورنہ اصل مقصد تو اشتراکیت کا غلبہ تھا۔ بھٹو صاحب کے اس نعرے پر جن لوگوں نے لبیک کہا ان کی فہرست پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو سکتی ہے کہ ان کے متبعین میں جو فعّال کارکن شامل ہوئے ان میں زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی تھی جو "ایشیا سُرخ ہے" کے ناپاک عزائم رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی

خواہشات کے مطابق ہی پیپلز پارٹی کا منشور تیار ہوا اور اس کی جدوجہد کے خطوط متعین کیے گئے۔ اس پورے قافلے میں کوئی ایک "رجل رشید" بھی ایسا دکھائی نہ دیتا تھا جو "اسلام ہمارا دین ہے" کی مؤثر انداز سے نمائندگی کر سکتا۔ اسلام کے اس واضح خلا کو پُر کرنے کے لیے اُن افراد کو آگے لایا گیا جنہیں اسلام سے زیادہ اپنے مفادات عزیز تھے اور جن کے بارے میں بھٹو صاحب اور اُن کے رفقائے کار کو اس بات کا پورا اطمینان حاصل تھا کہ وہ اُن کی جدوجہد میں اسلام کے کسی تقاضے کو بھی قطعاً حائل نہ ہونے دیں گے بلکہ اللہ کے دین کو نیازمندی کے اُس مقام پر لے آئیں گے جہاں سے اُن کے ہر قول اور فعل کی بآسانی تائید ہوتی رہے گی۔ پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے پہلے اور بعد کی سرگرمیوں پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ کیا ان سرگرمیوں سے اسلامی نظام کی راہ ہموار ہوئی ہے یا اشتراکیت کو مختلف دائروں میں نفوذ کرنے کے مواقع فراہم ہوئے ہیں؟

حکومت کے نشریاتی ادارے یہ سر اقتدار طبقے کی بعض ضرورتوں اور مصالح کے تحت ان چند کارروائیوں کا بڑھا چڑھا کر تذکرہ کرتے رہتے ہیں جن سے اُس کی اسلام دوستی ظاہر ہوتی ہے لیکن حکومت کی عام روش کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اُس نے عوام کے احساسات سے کھیلنے کے لیے اسلام کے نام پر جو چند کام کیے ہیں وہ نتائج کے اعتبار سے اُس ضعیفہ کے طرزِ عمل سے کسی طرح بھی مختلف نہیں جو اپنی محنت کے ثمرات کو خود برباد کرنے کا جنون رکھتی ہے۔ حکومت کی اسلامی خدمات میں جن چند نمایاں خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے اُن میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد ہے۔ جو لوگ اس کانفرنس کی کارروائیوں سے واقف ہیں انھیں اس بات کا علم ہے کہ دنیائے اسلام کا سارا جاہ و جلال کس مقصد کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ اس میں نہ تو کشمیر کا کوئی مسئلہ پیش ہوا اور نہ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے کوئی تدبیر سوچی گئی اور نہ مسلم ممالک کے اندر اسلامی نظام کے نفاذ پر غور کیا گیا بلکہ بھارت کی ننگی جارحیت کو جس کی وجہ سے یہ ملک پوری دنیا میں ہدفِ ملامت بنا ہوا تھا، جائز مانتے ہوئے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا۔ یہ غلط فیصلہ اس ڈرامائی انداز میں کیا گیا کہ ہر انسان سوچنے پر مجبور ہوا کہ کیا مسلم ممالک کی یہ سربراہی کانفرنس منعقد ہی اس غرض کے لیے کی گئی تھی کہ پوری دنیائے اسلام کو اس ذلت میں شریک کیا جائے اور غیر مسلم قوتوں کو یہ بتایا جائے کہ مسلمان اس دَور میں کس قدر بے بس اور بے حمیّت ہو گئے ہیں۔ حکومت کا یہ فعل کس حد تک تعمیری تھا اس کا

فیصلہ ہر انسان خود کر سکتا ہے۔

حکومت کا دوسرا بڑا اسلامی کارنامہ جسے وہ فخر و مباہات کے جذبات کے ساتھ بار بار بیان کرتی ہے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا معاملہ ہے۔ برسر اقتدار طبقے خصوصاً وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا یہ کارنامہ صحیح معنوں میں قابلِ ستائش ہوتا اگر وہ اپنے اِس اقدام کو پورے خلوص کے ساتھ اس کے طبعی نتائج تک پہنچانے کی کوشش کرتے لیکن حکومت نے اسمبلی کی کارروائی کے بعد اس مسئلہ پر جو معنی خیز سکوت اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف اضطراب انگیز ہے بلکہ اس سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اُسے غارت کرنے والا ہے۔ برسرِ اقتدار طبقے نے اسمبلی کی ایک قرارداد کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر دُنیائے اسلام سے مدح و ستائش تو حاصل کر لی اور اِس طرح اُسے اپنے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دینے میں اچھی خاصی مدد ملی۔ لیکن اگر اُسے اِس مسئلہ سے حقیقی دلچسپی ہوتی تو صرف اِس قرارداد کو منظور کر لینے پر اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ اس کے عملی تقاضوں کی تکمیل کے لیے بھی بھرپور کوششیں کی جاتیں۔ لیکن قرارداد پاس کرنے کے بعد اس سنگین معاملے کے بارے میں جس تغافل کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اُس سے اِس اہم فیصلہ کی معنویت ختم ہو رہی ہے۔ یہ حکومت کی اِس افسوسناک غفلت کا نتیجہ ہے کہ ملک کی ایک حقیر سی اقلیت، جس کی حیثیت کسی نظریاتی جماعت کی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے خلاف ایک سازشی ٹولہ کی سی ہے، اِس فیصلہ کو قبول کرنے سے مسلسل انکار کر رہی ہے۔ آخر یہ غداری نہیں تو اور کیا ہے؟ اِس گروہ کے رہنماؤں اور اس کے ذمہ دار افراد کے بیانات دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسمبلی کے اِس متفقہ فیصلہ کو ارکانِ اسمبلی کی محض غوغا آرائی سمجھتا ہے بلکہ بڑی ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس کی تذلیل کر رہا ہے۔
عقل یہ باور نہیں کرتی کہ حکومت اِن لوگوں کی باغیانہ سرگرمیوں سے بے خبر ہو۔ پھر ذہن یہ تسلیم کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہو سکتا کہ حکومت اِن کی قوت کے سامنے بے بس ہے۔ اگر اِن مفروضات میں سے کوئی مفروضہ بھی صحیح نہیں تو اِن حالات میں اِس امر کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ آخر نہایت ہی جارحانہ عزائم رکھنے والی اِس اقلیت کی تخریبی سرگرمیوں کو کیوں برداشت کیا جا رہا ہے؟ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں بلکہ اُسے اُس کی قدرت ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اِسی طرح حکومت کی نیت کا اُس کی کارروائیوں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کا ان معاندانہ سرگرمیوں کے بارے میں خاموش تماشائی کا سا طرزِ عمل اس حقیقت